دبستان لکھنؤ کا ایک عظیم دانشور مرزا دبیر

ڈاکٹر رشید اشرف خان

شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی

ہندوستان کے قابل فخر شاعر اور اعلیٰ درجے کے مرثیہ گو مرزا سلامت علی دبیر کی ہمہ جہت شخصیت اور بے مثال کمال فن اور دانشوری کو الفاظ کی گرفت میں لانا آسان نہیں۔ایک مضمون میں مرزا دبیر کے جملہ فضائل و محامد کو سمیٹ لینا احاطۂ امکان سے باہر ہے،لیکن ان کے چیدہ چیدہ امتیازات کا سرسری طور پر جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ مرزا دبیر ۲۹/اگست ۱۸۰۳ء کو دہلی کے محلّہ بلّی ماراں میں پیدا ہوئے۔ان کا خاندان ایرانی النسل تھا۔ملاّ ہاشم شیرازی ان کے مورث اعلیٰ تھے جو ایران کے مشہور اور باکمال شاعر ملاّ اہلی شیرازی کے سگے بھائی تھے۔یہ خاندان ایران سے ترک وطن کر کے ہندوستان آیا اور مغلیہ حکومت سے وابستگی اختیار کی۔مرزا دبیر کے والد مرزا غلام حسین ۱۷۷۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔تقریباً ۱۸۱۰ء میں دہلی کے سیاسی حالات نے نئی کروٹ لی اور مرزا دبیر اپنے والد کے ہمراہ لکھنؤ چلے آئے۔ مرزا دبیر جب لکھنؤ پہنچے تو اودھ میں سعادت علی خاں کا دور حکومت (۱۷۹۷ء تا ۱۸۱۴ء) تھا۔سعادت علی خاں کے اچانک انتقال کے بعد غازی الدین حیدر (۱۸۱۴ء تا ۱۸۲۷ء) تخت سلطنت پر بیٹھے اور انہی کے عہد میں مرزا دبیر کی شاعری کا آغاز ہوا۔مرزا دبیر کی پرورش و پرداخت ان کے شرفائے عصر کے طرز پر ہوئی،علاوہ ازیں اپنے دور کے جید علما مولوی غلام ضامن اور مولوی مرزا کاظم علی سے کسب فیض کیا اور بہت کم عمر میں ہی صرف ونحو کے علاوہ عربی وفارسی علم وادب،حکمت وفلسفہ،قرآن وحدیث اور تفسیر وفقہ میں لیاقت حاصل کرلی۔لکھنؤ کے چند نامی گرامی پہلوانوں سے جنگ کے داؤ پیچ سیکھے،نیز تجربہ کار گھوڑ سواروں سے گھوڑ دوڑ اور تلوار بازی کی مشق بہم پہنچائی۔ روضہ خوانی اور گفتگو کا سلیقہ اپنے خاندان کے بزرگوں اور اس دور کے شعرا،علما وادبا کی صحبتوں میں بیٹھ کر حاصل کیا۔مرزا دبیر کی شعوری کوشش تھی کہ وہ ''علوم بلاغت'' سے بھرپور عملی استفادہ کریں۔وہ جانتے تھے کہ بلاغت مرتبۂ کمال کو پہنچا ہوا ایک تصور ہے جس کا بنیادی مقصد دوسروں تک اپنی بات کو بہتر سے بہتر طریقے پر پہنچانا ہے۔جب مرزا دبیر کے والد نے دیکھا کہ ان کے بیٹے کا رجحان شعر گوئی کی طرف ہے تو انھوں نے لکھنؤ کے معروف مرثیہ گو اور مرثیہ خواں میر مظفر حسین ضمیر کا شاگرد بنوادیا۔استاد کی خاص توجہ سے لائق شاگرد کی شاعری میں چار چاند لگ گئے۔

کسی شخص کی دانشوری پر گفتگو اس وقت تک معتبر اور مستند نہیں کہی جاسکتی جب تک کہ اس کی شخصیت کے داخلی وخارجی پہلوؤں کو بروئے کار نہ لایا جائے۔

مرزا دبیر کی شخصیت انیسویں صدی میں لکھنوی تہذیب کی ایک باکمال شخصیت تھی جس نے اپنے عہد اور تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔مرزا دبیر کی شخصیت سازی میں مولانا مرزا کاظم علی کا کردار خاص اہمیت کا حامل ہے۔انہی کی رہبری میں مرزا کی سرشت میں تقدس اور انسانیت جیسے اوصاف نے جلا پائی۔وہ ایک صوفی منش انسان تھے۔مراثی کہنے کے لیے وہ ہمیشہ باوضو ہوتے اور مصلے کا اہتمام ضرور کرتے۔لکھنوی تہذیب مرزا دبیر کے رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے تھی۔علم دوستی،حسن اخلاق،وضع داری اور ادب نوازی ان کی شخصیت کا وصف خاص تھا،علاوہ ازیں عالی ظرفی، فراخ دلی اور وسیع النظری ان کی شخصیت کے وہ نمایاں اوصاف تھے جن پر بعض مخالفین بھی رشک کرتے۔ایسی ارفع تہذیبی قدروں کا پاس ولحاظ مرزا دبیر کے مذہبی خاندان کی روایات میں شامل تھا۔یہ معزز خاندان علم وفضل کی دولت کے ساتھ ساتھ مال وزر،عزت وانا اور خودداری جیسی بیش بہا اور قیمتی سرمائے سے مالا مال بھی تھا۔زندگی کے عروج وزوال میں بھی مرزا دبیر نے نہ صرف اپنے خاندان کی اس گراں قدر ادبی وتہذیبی روایت کو برقرار رکھا بلکہ اپنی چند روزہ شہرت کے لیے اسے مجروح نہیں ہونے دیا۔یہی احساس نفس ان کی شخصیت کے انمول جوہر تھے۔مرزا دبیر کے شخصی فضائل کا تذکرہ کرتے ہوئے شاد عظیم آبادی ''کمک وخیرات'' کی ذیلی سرخی قائم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مرزا دبیر خفیہ سلوک کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔کئی اپاہج، نادار اور بیواؤں کو مشاہرے دیا کرتے تھے۔مرزا دبیر غدر کے بعد جب عظیم آباد (پٹنہ) جاتے تو دیکھتے کہ ان کے اکثر ملنے والے نہایت عسرت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔چنانچہ وہ ان افراد کے لیے بنارس کے زریں اور ریشمی کپڑے لاتے اور ایسے دوستوں کو تحفے کے طور پر دیتے تھے۔اگر کوئی صاحبِ دختر ہوتے تو کہتے، یہ

میری بھتیجی کے جہیز میں شامل کر لیجیے۔''[1]

مرزا دبیر کے تعلق سے اگر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ و مشاہدہ سر آنکھوں پر، ان کے کردار میں شیرینی و لطافت یا انسان دوستی و فیاضی لاکھ قابل تعریف سہی، لیکن ان صفاتِ تشخصی کا تعلق بحیثیت دانشور (Intellectual) سے کیا ہے؟ اس ضمن میں یہ عرض کر دینا غیر ضروری نہ ہوگا کہ لفظ ''دانشور'' ایسے تعلیم یافتہ شخص کے لیے متصف ہونا زیبا دیتا ہے جو بین الاقوامی سطح پر سیاسی، سماجی، ادبی اور تہذیبی مسائل پر غور و فکر کا عادی اور صائب الرائے ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی کے تغیرات پر گہری نظر رکھتا ہو۔ مرزا دبیر کی علمی حیثیت ایک مینارۂ نور کی سی تھی۔ عربی و فارسی زبان پر انھیں یکساں فضیلت حاصل تھی۔ یہی وجہ تھی کہ رجب علی بیگ سرور، مرزا اسد اللہ خاں غالب، منیر شکوہ آبادی، ناسخ اور واجد علی شاہ جیسے ادب نوازوں کے یہاں مرزا دبیر کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی دبیر کی علمی حیثیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مرزا صاحب کی علمی حیثیت بہت بلند تھی۔ عربی و فارسی میں دستگاہ کامل حاصل تھی۔ تمام علوم عقلی اور نقلی پر حاوی تھے اور طبقۂ علما میں شمار کیے جانے کے لائق تھے''[2]

دانشوری ایک جوہر خداداد ہے جو بطور خاص خدا کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے۔ اس دانشوری کا اظہار اکثر و بیشتر بے ارادہ مختلف شکل و صورت میں ہو جاتا ہے۔ مرزا دبیر کے شاگرد سید اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی کے درج ذیل اشعار استاد کی مدح کے غماز نہیں بلکہ ان کی دانشوری کا شاعرانہ اعتراف ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خلیل کعبۂ فکرِ رسا، جناب دبیر
کلیم طور فصاحت ضیا، جناب دبیر
جہان معنی و سرمایہ بخش دانش و علم
مربیِ ورع و اتقا، جناب دبیر
زبان فارسی و اردو کی بلاغت میں
برنگ موجۂ آب بقا، جناب دبیر
کمال مرثیہ میں فخر سابق و لاحق
بہار جنت بزم عزا، جناب دبیر
حدیث و فقہ و تفاسیر کے بھی دریا سے
نکالتے ہیں در بے بہا، جناب دبیر

مرزا سلامت علی دبیر ادب کے کوئی نقاد نہ تھے، لیکن وہ ان معنوں میں دانشور ضرور تھے کہ اپنے ہم منصب شعرا کی علمی و فنی فروگزاشتوں پر انھیں ٹوکتے بھی تھے اور اگر خدانخواستہ خود اپنے کلام میں کوئی فنی سقم نظر آتا یا کوئی صاحب نظر اس کی نشان دہی کرتا تو اسے قبول بھی کر کے خود ہی اپنی اصلاح کر لیتے تھے۔ ایسا اقدام کرنے کے لیے بڑی جرأت، عالی ظرفی اور علم و فضل درکار ہے۔ دانشوری کے حوالے سے دور حاضر کے معتبر اور صاحب اسلوب نقاد شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''دانشوری کی پہچان یہ ہے کہ وہ ہر معاملے میں اپنی سوچی سمجھی رائے رکھتا ہے، موقع پڑنے پر اس کا اظہار کرتا ہے اور فریق مخالف کو بھی اپنی رائے رکھنے کا حق دیتا ہے۔ سوچی سمجھی رائے کے لیے شرط یہ ہے کہ صرف ایک نمونے، مثال یا نظام کے بل بوتے پر رائے نہ دے''[3]

جیسا کہ گزشتہ سطور میں ذکر ہو چکا ہے کہ ایک سچا دانشور دوسروں کی فروگزاشتوں پر انھیں ٹوکتا بھی ہے اور خود اپنی کوتاہیوں اور اشتباہات کا اعتراف کرتے ہوئے بذات خود یا بالاعلان ان کی درستگی اور تصحیح کی ہمت بھی رکھتا ہے۔ اس ضمن میں دبیر کے تعلق سے لکھنؤ کی ایک بہت مشہور روایت ہے کہ ایک مجلس عزا میں مرزا دبیر نے یہ مصرع پڑھا:

بحرِ نبی کا گوہر یکتا حسین ہے

چونکہ یہ واقعہ لکھنؤ کا ہے جہاں کے حضرات زبان کی باریکیوں پر فوراً گرفت کرتے تھے۔ سامعین میں ایک صاحب جو ''انیسیے'' تھے بحر نبی کی صوتی مناسبت سے بہرے نبی کی طرف بھی ذہن کو متوجہ کرتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے با آواز بلند کہا کہ ''سبحان اللہ جناب کیا بہرے نبی ہے۔ دوسرے سامعین مڑ مڑ کر معترض کو دیکھنے لگے۔ دبیر نے فوراً اپنا اصلاح شدہ مصرع دہرایا:

کانِ نبی کا گوہر یکتا حسین ہے

معترض نے پکار کر کہا ''ماشاء اللہ نبی کانے بھی تھے''؟ مرزا دبیر نے واہ واہ اور سبحان اللہ کا شور کم ہونے کے بعد فرمایا:

گنجِ نبی کا گوہر یکتا حسین ہے

منبر کے سامنے بیٹھے ہوئے ایک اور انیسیے نے لقمہ دیا کہ لیجیے صاحبان ہمارے نبی معاذ اللہ گنجے بھی تھے۔ اس برجستہ کنایہ پر قریب تھا کہ محفل زعفران زار بن جاتی، لیکن چشم زدن میں مرزا کے اصلاحی مصرعے نے مجلس کو خاموش کر دیا جب انھوں نے یہ پڑھا:

کنزِ نبی کا گوہر یکتا حسین ہے

یہ مصرع سن کر انیسیے اور دبیریے بیک وقت جزاک اللہ اور سبحان اللہ کی آوازیں بلند کرنے لگے۔ گویا اس غیر معمولی واقعہ نے ثابت کر دیا کہ مرزا سلامت علی دبیر ماہر زبان اور استاد فن تو ہیں ہی، لیکن وہ ایک حقیقی دانشور بھی ہیں جو اعتراضات پر نہ مضطرب ہوتے ہیں اور نہ برافروختہ۔

دانشوری کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اس کا مطالعہ و مشاہدہ ہمہ جہتی، گوناگوں یا Multifarious بھی ہو یعنی وہ یہ نہ کہے کہ میں تو بس تاریخ یا فلسفہ کا

اختصاصی ہوں مجھے ادب یا سائنس سے کیا لینا دینا ہے بلکہ اسے ہر چیز سے سروکار رکھنا چاہیے۔ ایک حقیقی دانشور اگرچہ چند معاملات میں اختصاصی یا Expert ضرور ہوتا ہے، لیکن اس کی عام معلومات بے پناہ ہوتی ہے، اس کی دانشوری ایک دریائے بے کنار ہے جس میں سیکڑوں علوم وفنون کی امواج تہہ نشیں یا Under-Currents پوشیدہ رہتی ہیں۔ مرزا سلامت علی دبیر کے منتخب مراثی کے مطالعہ سے ان کی دانشوری کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر اپنے مراثی کو کامیاب بنانے کے لیے مرزا دبیر نے اپنی غیر معمولی قوت بیانیہ سے خوب کام لیا ہے۔ بیانیہ یا Narration کی حقیقت کو سمجھنا کافی مشکل ہے اس لیے ہم شمس الرحمٰن فاروقی کے خیالات سے استفادہ کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''دبیر کی مقبولیت اور کامیابی میں ان کے انداز مرثیہ خوانی کا بھی حصہ رہا ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ دبیر کے پڑھنے کا انداز بہت مؤثر اور بڑی حد تک منفرد تھا، لیکن آج تو ہم ان کا مرثیہ کاغذ پر پڑھتے ہیں اور ہمیں ان کے انداز خواندگی کے بارے میں کوئی براہِ راست معلومات نہیں۔ اس کے باوجود دبیر کا مرثیہ آج بھی خاصا مؤثر ہے۔ ایسا کیوں کر ممکن ہوسکا؟ میرا خیال ہے اس سوال کا ایک جواب اُن بیانیہ طرز گزاریوں میں ہے جن کے ذریعے دبیر کے مرثیے میں معنی قائم ہوتے ہیں۔''[۴]

مرزا دبیر نے بیانیہ میں معنی قائم کرنے کے لیے کئی ایسے طریقے اپنائے ہیں جن سے طرز گزاریوں میں خود بخود تنوع پیدا ہوگیا ہے۔ انھوں نے پیش آمد (Anticipation) اور پیش گوئی (Prognosis) کو ملا دیا ہے۔ بالفاظ دیگر مرزا دبیر نے زمانۂ حال اور زمانۂ مستقبل کو بڑی ہنرمندی سے یکجا کر دیا ہے۔ مثلاً انھوں نے ایک مرثیے کے بند میں حضرت امام حسین کی شہادت کو بیان کرنے سے پہلے وہ قرآن کے حوالے سے ''**وفدینا بِذِبحٍ عظیم**'' کا ذکر کر کے واقعۂ کربلا کی ماضیت کا اشارہ بھی کر دیا ہے اور پھر آئندہ وقوع پذیر ہونے والے سانحۂ کربلا کی پیشین گوئی بھی کر دی ہے۔ یہ بند ملاحظہ ہو:

آدم کا داد رس بنی آدم میں کون ہے؟
یکتا خدا کے بعد دو عالم میں کون ہے؟
ذبحِ عظیم، مصحفِ اعظم میں کون ہے؟
ہر گھر کا چاند ماہ محرم میں کون ہے؟
جس کی خزاں بہار ہے وہ پھول کون ہے؟
جس کی دِیَت خدا ہے وہ مقتول کون ہے

دبیر نے اپنے بیانیہ کو تقویت دینے کے لیے بالکل نیا تجربہ کیا ہے یعنی اصل واقعہ سے ہٹ کر اسی واقعے میں ایک نیا بیان شامل کر دیا ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ واقعے کا پس منظر نہیں بدلا۔ اسے ہم انگریز شاعر ولیم شیکسپیئر (۱۵۶۴ء تا ۱۶۱۶ء) کے ڈراموں کا Aside کہہ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ساتویں محرم ۶۱ ہجری کے بعد کربلا میں ایک طرف تو خیام حسینی میں عبادت گزاری اور گریہ وزاری ہو رہی ہے اور اچانک پسرِ سعد یعنی یزیدی لشکر کی کیفیت بیان کی جانے لگتی ہے۔ یہ دو بند مرزا دبیر کے بیانیہ کی بہترین مثال ہیں:

خیمے میں ابنِ سعد کا مجمع تھا بے شمار
بیٹھا تھا زرد رو سرِ کرسیِ زرنگار
جاسوس پہلوؤں میں کھڑے تھے امیدوار
اور حکمِ صف کشی کا نقیبوں کو انتظار
جو قصد تھا، وہ دین کے برباد ہونے کا
جو ذکر تھا وہ فاطمہ زہراؑ کے رونے کا

کہنے لگا رفیقوں سے خوش ہو کے وہ شریر
اک خواب میں نے دیکھا ہے آج اے جوان وپیر
کہنے لگے یہ دست ادب باندھ کر شریر
ارشاد ہو وہ دیکھا ہے کیا خواب اے امیر
بولا وہ فکر جنگ سے تھا اضطراب میں
اپنے نبی کو ذبح کیا میں نے خواب میں

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ دانشور کی نگاہِ دوربیں دنیا کے ہر اہم شعبۂ حیات پر ہوتی ہے۔ علم نفس کا انسانی زندگی اور تمام مظاہر کائنات سے براہِ راست گہرا رشتہ ہے۔ خاص طور سے فنون لطیفہ کا علم النفس یا رواں شناسی کا عمل دخل ہر جگہ پوشیدہ یا واضح طور پر ہوتا ہے۔ مرزا دبیر کے چند مراثی کی روشنی میں ان کی مہارت نفسیات کے نمونے پیش کیے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر روز عاشورہ محرم، جب امام عالی مقام کے سبھی اصحاب، اعزہ واقربا جام شہادت نوش کر چکے ہیں تو مولیٰ نے ایک بلندی پر کھڑے ہو کر استغاثہ کیا اور پکار کر کہا کہ ہے کوئی جو آج میری نصرت کرے؟ ہے کوئی جو مجھ غریب الوطن کی آواز پر لبیک کہے؟ شہیدوں کی لاشیں اس آواز کو سن کر تڑپنے لگیں۔ اہل حرم کے خیموں سے خواتین کے رونے کی آواز آئی۔ حضرت امام حسینؓ نے جب خیموں کے نزدیک جا کر گریہ وزاری کا سبب پوچھا تو پتہ چلا کہ مولیٰ کی آواز سن کر اصغرِ بے شیر نے اپنے آپ کو جھولے سے گرا دیا ہے۔ آپ نے مادر علی اصغر سے کہا لاؤ میں بچے کو لے کر فوج کے سامنے جاؤں، شاید ترس کھا کر کوئی بچے کو پانی پلا دے۔ مادرِ علی اصغر نے گود میں لا کر بچے کو باپ کے حوالے کیا۔ اس وقت امام حسینؓ کی نفسیاتی کیفیت کیا تھی۔ مرزا دبیر کی زبانی سنیے:

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبطِ مصطفیٰؐ
لے تو چلا ہوں، فوجِ عمر سے کہوں گا کیا؟

نے مانگنا ہی آتا ہے مجھ کو نہ التجا
منت بھی گر کروں گا تو دیں گے بھلا وہ کیا؟

پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو مری
پیا سے کی جان جائے گی اور آبرو مری

بچے کی حالت اتنی غیر تھی کہ باپ سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ آخر ہمت کر کے وہ فوج اشقیا کے سامنے پہنچ تو گئے، لیکن اپنے خاندانی وقار، اپنے منصب، فطری خودداری اور حفظِ مراتب کا خیال کرتے ہوئے مولیٰ کے دل ودماغ کی ناقابل بیان کش مکش شروع ہوگئی۔ اس ضمن میں یہ بند ملاحظہ ہو:

پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے
چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھّرا کے رہ گئے
چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمھارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

یہ بات صد فیصد درست ہے کہ ہمارے بعض ادبی علما نے دبیرؔ کی علمی حیثیت اور ان کی شاعرانہ عظمت کو میر انیسؔ سے کمتر دکھانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ان میں مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حالی کے علاوہ مولانا شبلی کا نام لیا جاسکتا ہے۔ مولانا آزادؔ نے آب حیات میں کسی نہ کسی حوالے سے مرزا دبیر کا ذکر تو کیا ہے، لیکن مقدمۂ شعر وشاعری میں حالی نے دبیرؔ کا نام تک نہیں لیا۔ مولانا شبلی کے تعلق سے ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری لکھتے ہیں:

''انھوں نے موازنۂ انیس ودبیر لکھا۔ اس میں انیسؔ کی وکالت کی کتاب کا معتد بہ حصہ میر انیس کی تعریفوں سے مملو ہے اور صرف آخر کے چند صفحوں میں موازنہ کیا گیا ہے۔ موازنہ بھی کیسا؟ علامہ نے بعض کمتر، پست اور الحاقی شعر ان کی طرف منسوب کر کے موازنہ کا تاج محل قائم کیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ''دفتر ماتم کی بیس جلدوں کے علاوہ مرزا دبیر کے مراثی کی دو جلدیں ابتدا میں مطبع اودھ اخبار لکھنؤ سے چھپیں۔ یہ دونوں جلدیں نہ صرف غلط سلط چھپیں بلکہ ان میں الحاقی کلام بھی شامل کیا گیا۔ اس کا اعتراف محمد رضا معجزؔ نے بھی اپنی کتاب ''تطہیر الاوساخ'' میں کیا ہے۔ علامہ شبلی نے دبیرؔ کی فضیلتِ شاعری کو گھٹانے کے لیے زیادہ تر انھیں دو جلدوں سے مثالیں پیش کیں'' [۵]

اردو مرثیہ گوئی کی تاریخ میں مرزا دبیر کی شاعرانہ حیثیت اور ان کی دانشوری اپنی جگہ مسلم ہے۔ وہ فنِ مرثیہ نگاری کے نہ صرف معمار تسلیم کیے جاتے ہیں بلکہ ان کی حیثیت اس صنف شاعری میں ایک روشن ستون کی سی ہے۔ ان کی کثیر الجہات شخصیت اردو مرثیہ گوئی کی اعلیٰ ترین صفات کا درجہ رکھتی ہے۔

مرزا دبیر نہ صرف علم بیان میں ید طولیٰ رکھتے تھے بلکہ اس کا استعمال اپنے مراثی میں بڑی فراخ دلی سے کیا ہے۔ صنائع وبدائع لفظی ومعنوی کا تعلق الفاظ یا جملوں کی بناوٹ سے نہیں ہوتا بلکہ یہ کلام کا زیور سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دبیر نے مختلف صنعتوں اور استعاروں سے اپنے پورے کلام کو مزین کیا ہے۔ شوکت الفاظ کے شہنشاہ مرزا سلامت علی دبیر کے مراثی نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دوسرے ممالک میں بڑی شان سے پڑھے جاتے ہیں۔ مرزا دبیر ایک بسیار نویس مرثیہ گو تھے۔ انھوں نے ۷۴ سال کی عمر پائی۔ مرزا دبیر کے ناقدین نے ان کے مراثی کی تعداد کم وبیش دو ہزار بتائی ہے۔ اعداد وشمار کے مطابق مرزا دبیر نے ایک سال میں کم وبیش ۳۸ مرثیے کہے ہیں۔

جس طرح کوئی نابغۂ روزگار، خطیب و عالم دین، ماہر فنون لطیفہ یا اختصاصی بنیادی طور پر ان خوبیوں اور فضیلتوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اسی طرح ایک دانشور اللہ تعالیٰ کے کرم اور اس کی مرضی ومصلحت سے دنیا میں وارد ہوتا ہے۔ دانشور پیدا ہوتے ہیں بنا نہیں کرتے۔ اگر ایسا قانون فطرت ہوتا تو ہر کس وناکس اپنی خفیف الحرکت، دولت اور برخود غلط احباب کی مکارانہ چالوں سے دانشور بن جاتا۔ بقول شاعر:

ہر آن کہ سَر بہ تراشد قلندری نشود

(یعنی ہر وہ شخص جو کسی صوفی صافی کی طرح اپنا سر منڈوالے وہ قلندر نہیں بن سکتا) اس کے لیے اچھا خاندان، اچھا کردار، علم دوستی، روحانیت، سلامت روی اور عبادت وریاضت درکار ہے۔ آخر میں یہ بات کہنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے کہ مرزا سلامت علی دبیر کی فکری اور فنی جہات کے تعلق سے ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ رہا ہے کہ ہم نے اسے اکثر وبیشتر موازنے کی کسوٹی پر کسا ہے۔ ترفع وتنزل کے اس کھیل میں نقادوں کا قد بھلے ہی بلند ہوا ہو، لیکن خاص طور سے فن مرثیہ گوئی اور اس کی تفہیم اور تعین قدر کو ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچا ہے۔

حوالے:

۱۔ سید علی محمد شاد عظیم آبادی: پیمبران سخن۔ لاہور ۱۹۷۴ء ص: ۳۵
۲۔ دبستان دبیر ص: ۱۳۹
۳۔ مضمون بعنوان: سرور دانشور، از شمس الرحمٰن فاروقی، مطبوعہ سہ ماہی فکر ونظر علی گڑھ، مارچ ۲۰۰۱ء
۴۔ شمس الرحمٰن فاروقی: انداز گفتگو کیا ہے؟ (مضمون ''دبیر کے مرثیوں میں بیانیہ'' مئی ۱۹۹۳ء ص: ۱۰۹
۵۔ مرزا دبیر نمبر کتاب نما کا خصوصی شمارہ ستمبر ۱۹۷۷ء ص: ۲۱

○○